© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

داستانِ دانش

فلسفہ اور اس کے محتویات

فلسفہ ان دو لفظوں سے ترکیب پذیر ہے (PHILEIN) جس کے معنی محبت اور دلچسپی کے ہیں اور (SOPHIA) جو حکمت و دانش سے تعبیر ہے۔ یعنی علم و آگاہی اور جستجو و طلب کی وہ تمام کوششیں جو عقل و خرد سے بدرجۂ غایت محبت اور لگاؤ کی وجہ سے معرض ظہور میں آئیں۔ اس کا اطلاق فکر و تعمق کے ان نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن سے انسان کے فکری اثاثے میں اضافہ ہوا۔ اور سعی و عمل کی ان صورتوں پر بھی، جو کسی حقیقت کو دریافت کرنے کے سلسلے میں بروئے کار آئیں۔ اوّل اوّل اس کی فہرست میں نفسیات، منطق اور کائنات کے بارے میں علم و ادراک کی وہ تمام نوعیتیں شامل تھیں جن میں کسی نہ کسی اشکال سے تعرض کیا گیا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور اس فہرست کے ایک ایک موضوع کے حدود امتیاز نکھرنا شروع ہوئے، ان میں ہر باب ایک مستقل بالذات علم کا عنوان بنتا چلا گیا۔ اور آخر آخر میں یہ علم و معرفت کی اس شاخ کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا جس کا تعلق مابعد الطبیعی مسائل و افکار سے ہے۔

اس کا آغاز کب ہوا، اس کی ٹھیک ٹھیک تعیین مشکل ہے۔ ہمارے نزدیک وہ پہلا شخص، یا وہ پہلا گروہ اور معاشرہ یقیناً فلسفی تھا، جس نے زندگی اور کائنات سے متعلق سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کی۔ دراصل فلسفہ اس وقت جنم لیتا ہے جب کسی مسلمہ روایت، عقیدہ اور روایات کے بارے میں شکوک پیدا ہونے لگیں۔ اور معاشرہ کے ذہین افراد اذعانیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی ٹھان لیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ شک و ارتیاب کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تجربہ و مشاہدہ اور تحلیل و تجزیہ کی روشنی میں آگے بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔

فلسفہ کا تعلق مزاج [illegible] فلسفہ کے ارتقا کے بارے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دلچسپ سوال یہ ابھرتا ہے کہ طلب و جستجو کی اس دلآویز کہانی کی محرک کون شے ہے۔ کیا وہ مسائل مسلمات اور اجتماعی ماحول جس میں کوئی فلسفی سانس لیتا ہے، یا اس کا اپنا مزاج، طبیعت اور اس کے مخصوص تقاضے، تاریخ کے مطالعے سے دونوں طرح کے اثرات و عوامل کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک متعین دور کے مسائل، اجتماعی حالات اور پیش آمدہ گتھیوں نے معاشرے کے حکیمانہ ذہنوں کو فکر و اجتہاد کی تازہ کاریوں پر آمادہ کیا ہے۔ اور اس کے برعکس کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ ایک عبقری کے مزاج، شخصی حالات اور مخصوص رجحان طبع نے کسی فکر کو جنم دیا۔ اول الذکر گروہ میں افلاطون، ارسطاطالیس، ڈیکارٹ، لائبنیز اور ہیگل شامل ہیں۔ اور دوسرے گروہ کی نمائندگی کا فرض اسپینوزا اور شوپنہار ادا کرتے ہیں[1]۔

انداز فکر کی اس تقسیم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسپینوزا یا شوپنہار کی قسم کے فلسفی اپنے دور کے اجتماعی حالات، عقلی سطح اور اس دور کی مخصوص قطعی بیگانہ اور غیر متاثر رہے ہیں، جن سے ذہنوں کو جلا ملتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ جہاں پہلے گروہ میں فکر کی اپنی چال کے نقوش زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اور اس دور کی ارتقائی کیفیات اور تاریخ کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، وہاں دوسرے گروہ میں فکر و تصور کے سانچوں کے بنانے میں ان کے مخصوص مزاج اور شخصیت و کردار کو زیادہ دخل حاصل ہے۔

یونان ہی میں کیوں خصوصیت سے فلسفہ کی ارزانی ہوئی

یوں تو دنیا کے ان تمام گوشوں میں فلسفہ و حکمت کے سوتے پھوٹے ہیں جہاں صدیوں ایک خاص تسلسل کے ساتھ تہذیب و تمدن کے قافلوں کو رواں دواں رہنے کا موقع ملا ہے۔ تاہم خطۂ یونان کو اس بارے میں جو امتیاز و تفوق حاصل ہے اس میں اس کا کوئی حریف ثابت نہیں ہو سکا۔ یہاں فلسفہ و حکمت نے جس منہج، ترتیب اور قاعدے سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور جس جامعیت کے ساتھ علم و ادراک کی قریب قریب تمام شاخوں سے متعلق قیمتی معلومات کے ذخائر مہیا کیے ہیں، دنیا کے لٹریچر میں اس کی کوئی مثال پائی نہیں جاتی۔ صرف اسی خطہ کو یہ شرف کیوں حاصل ہوا کہ یکے بعد دیگرے یہاں سقراط، افلاطون اور ارسطو ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہو گئیں،

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنھوں نے تمام نوعِ انسانی کے لیے فکر و تحقیق کی راہیں ہموار کیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے یار لوگوں نے عموماً جس تناظر پر بھروسہ کیا ہے اس کا تعلق یونان کی جغرافیائی اور موسمی کیفیات، آسودہ حالی، سیاسی بیداری اور اس دیو مالا سے ہے، جس کو زیوس کے پجاریوں نے تیار کیا۔ لیکن ہم فلسفہ و فکر کے اس ظہور و ارتقا کو ایک دوسرے ہی زاویۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ہم نہیں مانتے کہ کسی ملک کی آب و ہوا اور اس کے تمدنی و تہذیبی پس منظر میں ایسے اسباب و علل کا ہونا ضروری ہے، جو عظیم ترین فکری شخصیتوں کی تخلیق و پرورش پر قادر ہوں۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ بسا اوقات تاریکی اور ظلمت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں فکر و نظر کے آفتاب ابھرے ہیں اور جہل و نادانی اور تہذیبی پستیوں کے بطن سے تہذیب و تمدن کے مجددین پیدا ہوئے ہیں۔ اس باب میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ آخر اس عہد سے کچھ پہلے یا بعد اسی خطۂ یونان سے جس نے اپنی آغوش میں افلاطون اور ارسطو جیسے حکما کی تربیت کی۔ اس قد و قامت کی شخصیتیں کیوں معرضِ وجود میں نہ آسکیں۔ ہم تاریخ کی اثر آفرینیوں کے منکر نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ کسی خاص عہد اور معاشرے میں جو سوالات اور چیلنج ابھرتے ہیں، وہ جواب اور حل نہیں چاہتے۔ یا وہ فکر و تعقل کے قافلوں کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ تعلیل کے اس اسلوب سے پوری پوری تشفی نہیں ہو پاتی۔

وحی اور فلسفہ دونوں کا اشکال ایک جیسا ہے

کچھ اسی طرح کا سوال انبیا علیہم السلام کے ظہور و بعثت کے تعلق سے بھی ذہنوں میں خلش پیدا کرتا ہے، اور انسان سوچتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ ساری دنیا کو چھوڑ کر جزیرۃ العرب ہی لطفِ ربانی کی ارزانیوں کا مرکز قرار پایا، اور ایک خاص ترتیب اور تسلسل کے ساتھ اسی خطۂ ارضی میں اسی کثرت کے ساتھ انبیا مبعوث ہوگئے۔ یعنی غیر سامی قوموں میں انبیا آئے بھی تو اس ترتیب اور تسلسل کے ساتھ نہیں کہ جس سے نبوت کے بارے میں کوئی واضح تصور قائم کیا جاسکے۔ یا ان کے متن اور نسب سے متعلق کوئی متعین رائے پیش کی جاسکے۔ ظاہر ہے یہ دونوں سوال اس نوعیت کے ہیں کہ ان سے نبٹنا آسان نہیں اور صرف اس تناظر اور پس منظر کو اس سلسلے میں کافی نہیں سمجھا جاسکتا، جس کا تعلق کسی قوم یا معاشرے کے مادی حالات اور رشتوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا ہے، کوئی صاحب فلسفہ و نبوت کے ظہور کی ان دونوں قسموں کو محض بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی سمجھ بیٹھیں، لیکن فرض و تخمین کے اس انداز میں دشواری یہ حائل ہے کہ اس کارگاہ حیات میں بخت و اتفاق نامی کسی شے کا کہیں وجود ہی نہیں پایا جاتا۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے، اسباب و علل کی بنا پر ہوتا ہے۔

دونوں کا حل تدبیر الٰہی کی روشنی میں

ہماری رائے میں، ان سوالات کا دو ٹوک جواب دینا تو مشکل ہے۔ البتہ اگر مادی اسباب و علل سے صرفِ نظر کر کے، ان پہیلیوں پر غور کیا جائے، کہ ہو سکتا ہے، یہ دونوں مظہر اللہ تعالیٰ کی مصلحت تکوینی اور تشریعی کے نتیجے میں وجود میں آئے ہوں، تو بڑی حد تک تمام عقدے حل ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی منطقی دستیاب ہو جاتی ہے، جس سے نفس مسئلہ کے تمام پہلو اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر یہ عالم آپ سے آپ پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اسے علیم و حکیم خدا نے ترتیب دیا ہے اور اس کے ترتیب دینے میں اس کی مصالح ربوبیت کارفرما ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تخلیق سے منشا ایزدی یہ ہے، کہ یہ صحیح معنوں میں اس دنیا میں اس کا نائب اور خلیفہ ثابت ہو یعنی ایک طرف تو یہ اسی دانش اور عقل و حکمت سے بہرہ مند ہو، جو اس کو اس کائنات کا راز دار بنا سکے، جو اس کے ذہن و فکر کو عمق و گیرائی عطا کر سکے اور جو علم و ادراک کے دائروں کو ان کناروں تک پھیلا سکے، کہ جہاں حقیقت و معنی کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ جہاں زمین اپنے راز اگل دیتی ہے اور آسمان کی فسوں سازیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف اس کو ایسی ہدایت و رہنمائی سے نوازا جائے کہ جس سے اس کا باطن چمک اٹھے، اس کے کردار میں استواری اور توازن پیدا ہو۔ اس میں خیر و نیکی اور حسن و جمال کی سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھیں۔ اس کا دل انوار و تجلیات الٰہی کا مہبط قرار پائے۔ اور دماغ کی تمام تر صلاحیتیں تکمیل ذات کے داعیوں کی تخلیق و پرورش کے لیے وقف ہو جائیں۔ اور یہ اس دنیا میں ایسی پر امن زندگی کی تشکیل پر قادر ہو سکے، جو سراسر عدل، انصاف اور رحم و عفو پر مبنی ہو۔ جس میں ظلم، دھاندلی اور جور کا دور دور تک نشان نہ ملے۔

ظاہر ہے انسانی الجھنوں کے یہ دونوں حقائق ایسے تھے کہ ان کو پورا کیے بغیر یہ ہرگز اس لائق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہو سکتا تھا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب و خلیفہ قرار پا سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے فیوض ربوبیت نے وجود کی دو مختلف سطحوں پر ان دونوں تقاضوں کی تکمیل کا سامان فراہم فرما دیا۔ تکوینی سطح پہ تو حکما اور فلسفی پیدا کیے۔ جنھوں نے علم و ادراک کی شمعیں فروزاں رکھیں اور تشریعی سطح پر انبیا و رسل مبعوث فرمائے، جن کی تعلیم و تزکیہ اور تربیت سے نوعِ انسانی میں نیکی اور خیر کی محبت پیدا ہوئی۔ اور یہ اپنی محدود "انا" سے نکل کر غیر محدود اور وسیع ترانا سے بندگی اور عبودیت کے رشتوں کو استوار کرنے کے لائق ٹھہرا۔

بات سوچنے کی یہ نہیں کہ جزیرۃ العرب ہی کیوں اس کثرت اور تسلسل کے ساتھ انبیا مبعوث ہوئے یا خطۂ یونان کو یہ شرف کیوں بخشا گیا کہ یہاں عقل و خرد کی اس درجہ ارزانی ہوئی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ تاریخ کی کسوٹی پر یہ دونوں تجربے صحیح ثابت ہوئے یا نہیں اور پوری نوعِ انسانی نے ان سے مقدور بھر فائدہ اٹھا کر اپنے فکر و نظر اور کردار و عمل کے زاویوں کو بدلا ہے یا نہیں؟

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہاں قدرتاً یہ سوال ذہنوں میں ابھرے گا کہ ہم نے فلسفہ و حکمت اور وحی و تنزیل کو کیونکر ایک ہی سکیم کے نفاذ کی دو تدبیریں قرار دیا۔ جب کہ ان میں ایک سرتا پا ہدایت پر مبنی ہے اور دوسری لغزش و خطا اور الحاد و زندقہ پر مشتمل خیالات و تصورات کو بھی اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اختصار کے ساتھ اس شبہے کے جواب میں ان دو نقاط کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ یہ کہ حکمت و فلسفہ کو ہم نے جو ایک تدبیر قرار دیا اور یہ کہا کہ اس سے انسانی فکر میں بہرحال جِلا پیدا ہوگی۔ تہذیب و تمدن کے قافلے آگے بڑھیں گے اور انسان اپنے اس شرف سے آشنا ہوگا کہ یہ حیوانِ عاقل ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ادھر اُدھر بھٹکے اور گمراہ ہوئے بغیر کشفِ حقائق کی نعمت سے بہرہ مند ہو جائے گا۔ تدبیر کی اس نوعیت کو تکوینی کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کا اسلوبِ تحقیق، اس کی رسائی کا انداز اور منہج مذہب اور دین کی راہ سے بالکل مختلف ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم اس کے اخذ کردہ نتائج سے مایوس نہیں ہوئے۔ انسانی فکر و تصور کے ہاں یہ [illegible] اور مکمل ہونا ہے۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک واضح شکل اختیار کرنے کے بعد بالآخر مذہب و دین کے حقائق سے بغل گیر ہونا ہے۔

سردست اس کے نظریات و تصورات میں جو اختلاف، تضاد اور بوقلمونی رونما ہے۔ یہ محض عارضی ہے اور اس وقت تک ہے جب تک شک و ارتیاب کے بادل چھٹ نہیں جاتے، اور انسان اپنی آنکھوں سے آفتاب حقیقت کی ضیا افروزیوں کا مشاہدہ نہیں کر لیتا۔

شہرتِ دوام حاصل کرنے والے حکما

یونانی فکر و فلسفہ کی تحقیق و ترتیب اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں جن لوگوں کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور جنھوں نے اپنے نظریات و افکار سے علم و ادراک کی پیچیدہ گتھیاں کھولنے کی مخلصانہ کوششیں کیں، ان میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

سقراط سقراط ۴۶۹ ق م بمقام ایتھنز پیدا ہوا۔ اس کا باپ سنگ تراش تھا اور ماں دایہ۔ شکل و صورت اچھی نہیں تھی۔ لیکن اس کا باطن روشن اور بدرجہ غایت اجلا اور پاکیزہ تھا۔ اس کا مقصدِ حیات یہ نہیں تھا کہ یہ کسی خاص مدرسۂ فکر کی بنیاد رکھے۔ بلکہ یہ تھا کہ اپنے دور کے لوگوں میں عقل و دانش اور نیکی کے لئے طلب و جستجو کے داعیوں کو اکسائے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو اس نے کوئی کتاب لکھی اور نہ کوئی مقالہ ہی تحریر کیا۔ اس کا پیشہ اگرچہ باپ کی طرح سنگ تراشی تھا۔ تاہم مسائل کے حل و کشود میں اس نے جو طریق اپنایا، وہ ماں کے پیشہ سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا۔ اس اسلوبِ تحقیق کو ایک دایہ کا اسلوبِ تحقیق کہا جا سکتا ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حقیقت ایک مولود کی طرح ہے، جو سوال و جواب کے بطن میں پنہاں ہوتی ہے، اور تولد چاہتی ہے۔ ایک حکیم کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ہشیار اور سمجھدار دایہ کی طرح اس تولد میں مددگار ثابت ہو۔

افلاطون نے اپنے مکالمات میں اس کے اسلوبِ تحقیق پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یہ ہر شخص سے ملتا۔ بازاروں اور گلیوں میں بچوں، عورتوں اور نوجوانوں کو روک لیتا۔ ان میں سے ایک ایک سے ملتا، اور ان سے محبت، تدبیرِ منزل، سیاسیات، شاعری، مذہب اور اخلاق کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا۔ اور کوشش کرتا کہ یہ لوگ ان تمام امور سے متعلق ان خیالات سے دست بردار ہو جائیں، جن کو انھوں نے بغیر سوچے سمجھے اختیار کر لیا ہے۔ بلکہ ان پر معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے خیالات و افکار میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہاں گھپلا ہے، کہاں منطقی استواری ہے۔ کیا حق ہے اور کیا حق نہیں ہے

حکومت وقت کو اس کی یہ روش پسند نہ آئی۔ اس کے خیال میں سچائی اور عقل و خرد کی اشاعت و فروغ سے لوگ حکومت کے بارے میں بھی تنقید کرنے لگیں گے۔ چنانچہ اس اندیشہ کے پیش نظر اس پر مقدمہ چلا۔ اور اس وقت کے حکمرانوں نے بالآخر بغاوت کے جرم میں اس کے لیے سزائے موت کا حکم صادر کر ہی دیا۔ اور اس عظیم انسان نے بغیر کسی گھبراہٹ اور خوف کا اظہار کیے نہایت اطمینان سے زہر کا پیالہ پی لیا۔

سقراط کے تلامذہ نے ہر چند چاہا کہ استاد کو جیل خانے سے بھگا لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن سقراط نے یہ کہہ کر ان کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیا کہ عزیزو! موت سے ڈرنے کے کیا معنی۔ موت کے بعد دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو زندگی کا تسلسل قائم رہے۔ یہ بھی اچھا ہے مرنے کے بعد نہایت ہی عمدہ لوگوں کی رفاقت میں رہنے کا موقع ملے گا۔ یا پھر موت کے معنی مکمل عدم اور نیستی کے ہیں۔ یہ بھی اس لحاظ سے بہتر ہے کہ زندگی کے اضطرابات اور کشمکش سے ہمیشہ کیلئے نجات حاصل ہو جائے گی۔

سقراط کے فلسفہ کی روح نوعِ انسانی کے نام یہ پیغام ہے کہ انسان کو ہمیشہ علم و ادراک کے در پے رہنا چاہیے۔ کیونکہ علم ہی سے خیر، نیکی اور سعادت کی راہیں واضح ہوتی ہیں۔ سقراط کے نزدیک جہاں بھی برائی اور شر ہے، وہاں کسی نہ کسی صورت میں، جہل و نافرمانی کا عمل دخل ہے۔ کیونکہ مکمل اور صحیح علم ہمیشہ صحیح عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ سقراط کے نزدیک علم اور نیکی دو مترادف لفظ ہیں۔ یعنی علم نیکی ہے اور نیکی علم کا منطقی نتیجہ۔ سقراط کا یہ قول "اپالوجی" میں درج ہے۔ کہ لوگو! تمہاری تمام تر تگ و دو کا محور نیکی کا حصول ہونا چاہیے۔ تم نے اگر اس مقصد کو پا لیا، تو دولت اور دوسری دنیاوی مسرتیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔

سقراط نے حقیقت اور سچائی کو دریافت کرنے کے لیے سوال در سوال کا جو انوکھا طریق ایجاد کیا، اسی نے آگے چل کر اس استقراء کی بنیاد ڈالی جس کی بیکن نے تکمیل کی

افلاطون

افلاطون عظیم فلسفی اور سقراط کا عظیم ترین جانشین ہے سقراط نے اپنے اسلوب تحقیق کی روشنی میں کئی اہم افکار [illegible] مسائل ابھرے، جو نتائج پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے، اور جو اشکالات فکر و نظر کے سامنے آئے، ان کا کوئی واضح، مفصل اور جامع حل دریافت نہ ہو سکا۔ افلاطون نے اس سلسلۂ تحقیق و تفحص کی تمام کڑیوں کو ایک مربوط اور جامع فلسفہ کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ اور ان تمام سوالات اور اشکالات کا تسلی بخش حل پیش کیا، جن کو فکر و استدلال کے سقراطی اسلوب نے ابھار دیا تھا۔

افلاطون کے نقطۂ نظر سے یہ تمام سوالات باہم ایک دوسرے پر مبنی ہیں، اور ان کو اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ان میں رشتہ و تعلق کی نوعیت کو واضح نہ کیا جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ حقیقت مطلقہ کیا ہے۔ پھر اس کی روشنی میں ان تمام اشکالات کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔ مثلاً زندگی کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ سلوک و معاملہ کے حدود کیا ہیں؟ ریاست کو کن اقدار کا پابند ہونا چاہیئے اور یہ کہ خود ریاست کا تعلق، پوری کائنات انسانی کی مصلحتوں سے کس حد تک وابستہ ہے؟ یہ اور اس قسم کے تمام دیگر سوالات، ایک مرکز اور ایک محور چاہتے ہیں، جسے افلاطون نے دریافت کیا۔

افلاطون مکالمات میں جن نکات کی تشریح کرتا ہے، ان کی تائید و توثیق کیلیے عموماً سقراط کے اقوال نقل کرتا ہے۔ یہ اقوال واقعی سقراط کے ہیں یا افلاطون نے اپنی طرف سے ان کو استاد کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ رسل نے اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے اصلی سقراط اور افلاطون کے پیش کردہ سقراط میں کچھ فرق ہو۔

افلاطون نے اپنے پیش رو حکما کے خیالات و افکار کو ایک حد تک مان لینے میں کسی تعصب کا اظہار نہیں کیا۔ مثلاً اس نے سوفسطائی متکلمین کے اس نظریہ کو مان لیا کہ حواس سے اخذ کردہ نتائج قطعی نہیں ہوتے۔ اور سقراط کی ہم نوائی میں اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ فقط تصورات و مثل ہی حجت و سند ہیں۔ ایلیائی مدرسہ فکر اور ہیراکلیٹس کے مدرسہ فکر میں۔ یہ بات مابہ النزاع چلی آ رہی تھی کہ یہ عالم متحرک ہے یا ساکن۔ افلاطون نے یہ کہہ کر بحث ختم کر دی۔ کہ جہاں تک اس عالم مشہود و محسوس کا تعلق ہے، اس میں بلاشبہ حرکت، تغیر اور تبدیلی پائی جاتی ہے، مگر تصورات و مثل یا حقیقی عالم میں کبھی تجدد و تغیر واقع نہیں ہو پاتا۔

اسی طرح اس دور کے [illegible] توازن، حقیقت پسندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا۔ اور ایک ایسے فلسفہ کی داغ بیل ڈالی جس کو یونانی فلسفہ کی جان اور عطر کہنا چاہیئے۔

افلاطون ایک کھاتے پیتے شریف گھرانے میں پیدا ہوا۔ (۴۲۷ ق م میں) اس نے سقراط سے تلمذ کا رشتہ جوڑا اور تادم حیات اس کی رفاقت میں رہا۔ سقراط کی موت کے بعد اس نے ایشیائے کوچک کے بہت سے ممالک کی سیاحت بھی کی۔ مصر میں بھی چند سے قیام کا اس کو موقع ملا۔ اس کی سیاحت کے پیچھے یہ مصلحت پنہاں تھی کہ یہ نصب العین ریاست کے لیے خدوخال دریافت کرے۔ اس کی تعلیم کا آغاز موسیقی، شاعری، نقاشی اور فلسفہ سے ہوا۔ اس کا شمار ان خوش قسمت حکماء میں ہوتا ہے، جن کی تعلیمات بحفاظت اگلی نسلوں تک پہنچیں۔ مکالمات کے علاوہ کچھ خطوط بھی اس کی طرف منسوب ہیں۔ جن میں اکثر اہم فلسفیانہ مسائل پر مشتمل ہیں۔

ارسطو

ارسطو ۳۸۴ ق م میں پیدا ہوا۔ اس کا والد فلپ کا سرکاری طبیب تھا۔ سترہ برس کی عمر میں اس نے افلاطون کی اکادمی میں فلسفہ و حکمت کی تعلیم شروع کی۔ یہاں اس نے پڑھا بھی، اور تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ فلپ نے اپنے بیٹے سکندر کی تربیت کے لیے اسے بلا بھیجا، اس نے یہ دعوت قبول کر لی، اور ایک عرصہ تک اس کا اتالیق رہا۔ اس کی تعلیم کا عمومی اسلوب یہ تھا کہ یہ ٹہلتا جاتا اور اسی اثنا میں تلامذہ کے ساتھ فلسفہ و حکمت کے اسرار و حکم بھی بیان کرتا جاتا۔ اس کے تلامذہ یا پیروکاروں کو مشائین (PERIPATICS) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کردار و سیرت کے اعتبار سے ارسطو ایک شریف انسان تھا، اور ان تمام خصوصیات سے بہرہ مند تھا، جن کو یونانی شرافت و عظمت کا معیار گردانتے تھے۔ اس کی تحریرات کا اچھا خاصہ حصہ محفوظ ہے۔ کچھ کتابیں دست برد زمانہ کی نذر بھی ہو گئیں۔ تاہم جو بچ گئی ہیں وہ بھی کم نہیں، ان سے اس کی فلسفیانہ عظمت کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے جن افکار کو قلمبند کیا اس کو مندرجہ ذیل عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منطق: جس کو ان کی اصطلاح میں آرغنن (ORGANON) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایسا آلہ جس سے علم و ادراک کی پیچیدگیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ طبیعیات: اس موضوع پر آٹھ کتابیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ نفسیات:- روح کی حقیقت کے بارے میں اس کی تین کتابیں ہیں۔

۴۔ حساب و ریاضی:- اس پر اس کے تقریباً چودہ رسائل پائے جاتے ہیں۔

۵۔ اخلاقیات:- اس پہ اس نے دس کتابوں میں اپنے تصورات سمونے کی کوشش کی ہے۔

۶۔ سیاسیات:- اس پر اس کی آٹھ کتابیں ہیں۔

۷۔ علم الخطابت:- اس بارے میں جو تحریری مواد ملا ہے، وہ اس کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ خود اس کا اپنا نہیں۔ اس میں ادب اور اس کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔

اس کے اسلوب فکر میں وضاحت تعیین کی نمائندگی نمایاں ہے۔ یہ جب کسی مسئلہ پر بحث کرتا ہے۔ تو اس میں جذباتیت کی مطلق جھلک نہیں ہوتی۔ شاعری اور خطابت آرائی بھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے اس کی تحریرات کو غیر جانبدارانہ، ذاتی تعصبات سے قطعی پاک، اور نفس موضوع سے علاقہ وابستہ و پیوستہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ اس کا انداز بیان کہیں کہیں قدرے خشک اور غیر دلچسپ ہو گیا ہے۔ ارسطو کا شمار دنیا کے ان عظیم مفکرین اور نابغہ روزگار لوگوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے کائنات کی عظیم ذہنی و فکری تحریکات کو متاثر کیا اور ایسے نظام حکمت و دانش کی داغ بیل ڈالی جو صدیوں تک بلا شرکت غیرے قلوب و اذہان انسانی پر چھایا رہا۔

ارسطو نے جب فکر و دانش کی مسند سنبھالی تو اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنے استاذ کے خیالات و افکار کی اصلاح کرے۔ ان میں جہاں جہاں ناہمواری اور تضاد رونما ہے، اس کو دور کرے۔ اور ایک ایسے قانون سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، جو ہر لحاظ سے معقول اور استوار ہو۔ مثلاً افلاطون کے تصور کائنات میں اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی کہ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ کیا یہ حقیقی دنیا ہے یا کسی حقیقی دنیا کا انعکاس اور پرتو ہے۔ افلاطون کے نزدیک حقیقی وجود سے صرف "مثل" اور تصورات ہی بہرہ مند ہیں۔ اور یہ عالم رنگ و بو انہی مثل کے "مثنیٰ" یا ظل اور سایہ ہیں۔

ارسطو کے لیے یہ مسئلہ پریشان کن تھا۔ کہ مثل کا عالم مادی سے رشتہ و تعلق کیونکر ثابت کرے۔ "مثل"، ساکن، مکمل اور ازلی نوعیت کے حامل ہیں۔ اور یہ عالم امکان متحرک، تغیر و تبدیل کا ہدف و شکار اور ناقص ہے۔ اس صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دونوں میں جو خلیج حائل ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کو پاٹا جا سکے۔

ارسطو نے اس اشکال کا حل یہ تلاش کیا کہ مُثل اور تصورات کو آسمان سے اتار کر زمین پہ لے آیا۔ اس نے کہا کہ ان صور و مُثل کا مقام ستاروں سے آگے اور دور کہیں علم ازلی میں ماننے کے بجائے اس دنیا میں مادہ و ہیولیٰ میں ماننا زیادہ قرینِ عقل و حکمت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ صور خود مادہ ہی میں موجود ہیں اور مختلف الانواع اشکال میں ڈھلنے اور سطحِ وجود پہ نمایاں ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔ اس انکشافِ صورت و ہیولیٰ میں جو منافات اور دوئی ہے وہ رفع ہو گئی۔

مسلمانوں میں جن لوگوں نے یونانی علوم و معارف کو بالعموم اور ارسطو کے ذخائرِ حکمت و دانش کے بارے میں بالخصوص غیر معمولی مہارت و عبور حاصل کیا۔ اور ان میں اسلامی فکر کی جھلک پیدا کی۔ ان میں سرفہرست یہ شخصیتیں ہیں۔

۱۔ کندی ۲۔ فارابی ۳۔ ابن سینا ، ۴۔ غزالی اور ۵۔ ابن رشد

کندی کا پورا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی ہے۔ اس کا شجرۂ نسب ملوک کندہ کندی سے ملتا ہے۔ یہ حسب و نسب کے لحاظ سے خالص عربی روایات کا حامل تھا۔ اس نے مامون معتصم اور متوکل کا زمانہ پایا۔ اور سب کے ہاں عزت و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔

اپنے مولد و نسب کے اعتبار سے یہ اگرچہ خالص اور ستھرا عربی تھا، مگر ذہن، فکر اور ذوق کے اعتبار سے اسے پورا پورا یونانی کہنا چاہیے۔ وہی علوم کی گوناگونی، وہی ذوقِ تصنیف، وہی جامعیت و استیعاب، وہی سلیقہ اور وہی تنظیم و فکر کی گہرائی اور اونچ یہ پہلا اور آخری حکیم و فلسفی ہے، جسے فیلسوف العرب کے معزز لقب سے نوازا گیا۔ الفہرست، اخبار الحکما اور طبقات الاطباء میں اس کے علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس نے طب، فلسفہ، ریاضی، منطق، الحان، ہندسہ، طبائع، اعداد اور نجوم میں درجہ کمال حاصل کیا۔ اور ان تمام علوم کے بارے میں متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کی کتابوں کی کل تعداد ۲۳۱ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ اس نے یونانی فکر کی رنگا رنگی کو کس حد تک اپنایا اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ جہاں اس نے فلسفہ سے متعلق بائیس کتابیں لکھیں ہندسہ پہ تیئس ۲۳ تصنیفات چھوڑیں۔ فلکیات پر سولہ کتابیں رقم کیں۔ وہاں طب ایسے فن پہ اس کی بائیس ۲۲ کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ سیاست پہ تیرہ کتابوں کا نام ملتا ہے۔ کرویات پر اس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ اور موسیقی جس کا آج کل غیر ثقہ فنون میں شمار ہوتا ہے، اس پر اس کی سات کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ افسوس ہے علم و حکمت کا یہ تمام ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ اور صرف چند کتابیں دست برد زمانہ سے بچ سکیں، جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

فارابی

فارابی، ابونصر الفارابی کے نام سے مشہور ہے۔ اصل نام محمد بن طرخان ہے۔ اس کا تعلق اگرچہ فاراب سے ہے، لیکن سرزمین شام ہی میں اس نے تعلیم و تربیت کے مرحلے طے کیے۔ اس نے کندی کی طرح تمام علوم مروجہ میں کمال حاصل کیا۔ اور فیلسوف کامل کے اعزاز سے مشرف ہوا۔ منطق، فلسفہ اور فن تعلیم کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے اور ان سے استفادہ کے اسالیب کو واضح کرنے میں یہ کندی سے کہیں آگے ہے۔ اس نے ایسے عنوانوں پر بھی طبع آزمائی کی جو بالکل اچھوتے تھے۔ اور ماضی میں کسی نے بھی ان کے متعلق کچھ نہ لکھا تھا۔

نصب العینی ریاست کو کن اقدار پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کا شرف عموماً مغربی علما کو حاصل ہے۔ لیکن آج سے ٹھیک ایک ہزار سال سے پہلے فارابی مبادی آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ کے نام سے معرکۃ الآرا کتاب لکھ چکے ہیں جو لندن میں چھپ چکی ہے۔

فارابی کو معلم ثانی کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منصور بن نوح السامانی نے اس کے سپرد یہ خدمت کی کہ یہ علوم عقلیہ کے تراجم کی تصحیح اور تلخیص کا فریضہ انجام دے۔ اس نے اس فرض کو بکمال خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس موضوع پر اس نے جو جامع کتاب لکھی۔ اس کا نام "تعلیم ثانی" رکھا۔ یعنی ارسطو کے بعد یہ دوسری فکری و عملی کوشش تھی، جس میں تمام علوم پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ فارابی، جہاں علوم و فنون میں حکیمانہ ذوق سے بہرہ مند تھا۔ وہاں فن موسیقی میں بھی یکتائے روزگار تھا۔ القانون اسی کی اختراع ہے۔

ابن سینا

وہ عظیم فکری شخصیت ہے، جس نے اپنے نبوغ و عبقریت سے دنیائے دانش کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے نہ صرف قدیم یونانی علوم و معارف پر گراں قدر تصانیف یادگار چھوڑیں، ان علوم میں اپنی طرف سے اس نے کچھ اضافے بھی کیے۔ جن پر ابن رشد نے تہافۃ التہافۃ میں جابجا احتجاج کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ ارسطو کی تصنیفات میں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

فلسفہ و طب کی دنیا میں صدیوں اس کے [illegible] دکھائی دیتی رہی۔ اس کی تصنیفات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں مشرق میں مقبول رہیں وہاں نہ صرف مغرب میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں بلکہ مغرب کی تعمیرِ نو کے سلسلہ میں ان سے بے حد استفادہ بھی کیا گیا۔ اسلامی فلسفہ و دانش اور فکر و فن کی تابناکیوں میں اسلام کا وہی مقام ہے جو یونانی علوم و معارف میں ارسطو کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو شیخ الرئیس اور ارسطو کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کا نام نامی ابو علی الحسین ابن عبداللہ ہے۔ باپ کا تعلق بلخ سے تھا، ۳۷۰ھ میں بخارا کے ایک گاؤں خرمیثن میں پیدا ہوا۔ ابتدا ہی سے حفظ و فطانت کے غیر معمولی جوہر سے بہرہ مند تھا۔ عمر ابھی دس سال سے متجاوز نہیں ہو پائی تھی کہ اس نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔ یہی نہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں منطق، ہندسہ، طبیعیات اور طب وغیرہ سے اس نے فراغت حاصل کر لی۔

اس کے مطالعہ کے بہترین اوقات، رات کے وہ پرسکون لمحے تھے جس میں کہیں شور و غل سنائی نہیں دیتا۔ یہ راتوں کو جاگتا، اپنے رفقائے خاص کے ساتھ دنیا سے رابطہ رکھتا، اور اس کے ساتھ پڑھتا۔ بحث و تمحیص میں حصہ لیتا اور افکار و تصورات کی زلف دوتا کو ایک متعین نہج سے نکھارتا اور ترتیب دیتا۔ ہمدان میں اٹھاون برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی متعدد کتابوں نے شہرت دوام حاصل کی۔ مثلاً القانون جو طب پر پہلی مستند اور جامع دستاویز ہے۔ نہ صرف اسلامی عہد زریں میں متفق علیہ متن کی حیثیت سے رائج رہی بلکہ موجودہ مغربی تہذیب کی اٹھان تک مغرب میں برابر زیر درس رہی۔ اور یورپ کے بڑے بڑے اساقفہ نے بادل نخواستہ عیسائی معلمین سے درخواست کی کہ اسلام دشمنی کے جذبہ کے باوجود اس کتاب کو اپنی درسگاہوں میں ضرور پڑھائیں۔

فلسفہ و منطق سے متعلق جو کتابیں آج تک علمی حلقوں میں رائج و مقبول ہیں، ان میں الشفاء، الاشارات اور نجاۃ کا نام سرفہرست ہے۔

ریاضی اور طبیعیات سے متعلق اس کی تقریباً پندرہ کتابیں مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس نے سیاسیات اور موسیقی پر طبع آزمائی کی ہے۔ ابن خلکان جلد ا ص ۱۵۲۔ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲ اور تراجم الحکماء ص ۶۸ میں اس کے حالات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

غزالی

غزالی کا پورا نام محمد بن محمد بن احمد الغزالی ہے۔ طوس مولد اور مسقط راس ہے۔ ابوحامد کنیت اور حجۃ الاسلام [illegible] لقب ہے [illegible]ھ میں وفات پائی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غزالی نے برسوں نظامیہ میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ پھر تحقیقِ حق کے داعیوں نے زہد و ورع کی طرف مائل کیا۔ اور قریباً دس برس تک حجاز، شام اور بیت المقدس کے شہروں اور ویرانوں میں گھومتے پھرتے رہے اور مشکل مسائل میں غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ حکما کھلی اور واضح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ان کی تردید پر آمادہ ہوئے۔ پہلے مقاصد الفلاسفہ لکھی۔ تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ جس گروہ کے مزعومات کی یہ تردید کر رہے ہیں، اس کے علوم و معارف سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ اس کے بعد تہافتہ الفلاسفہ میں ان کے تضادات اور خلافِ اسلام عقائد کی قلعی کھولی اور ان کے ایک ایک دعوی کو عقل و خرد کی روشنی میں جانچا اور اس کی خامیاں واضح کیں۔ مقاصد اور تہافتہ کے علاوہ انھوں نے متعدد معرکہ کی کتابیں لکھیں، جن میں کتاب البسیط، الوجیز، المنقذ من الضلال، المضنون بہ علیٰ غیر اہلہ احیاءُ علوم الدین، بدایتہ الہدایہ اور جواہر القرآن مشہور ہیں۔

غزالی بیک وقت صوفی، فقیہہ، متکلم اور فیلسوف و حکیم بھی ہیں، انھوں نے جہاں نظامِ عقائد کو دلآویز شکل میں پیش کیا اور ایمان باللہ، ایمان بالرسل، حشر و نشر اور عبادات کے لطائف و دقائق پر روشنی ڈالی۔ وہاں اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی خامیوں اور تضاد و ناہمواریوں کی نشان دہی بھی کی۔ اور حکما کے اس بزعمِ خود غلط گروہ کے پندارِ غرور کو خاک میں ملا دیا، جو عقلیات کے نشہ میں چور تھے اور بزعمِ خود یہ سمجھے ہوئے تھے کہ خردِ خام ہی کے بل پر علم و ادراک کی تابندگی سے روشناس ہونا ممکن ہے۔

انھوں نے تہافتہ الفلاسفہ میں تنقید کے جس منہاج کی طرح ڈالی۔ اس کی حیثیت صرف یہ نہیں تھی کہ یہ ایک تخریبی اور منفی نوعیت کی کوشش ہے۔ بلکہ اس تنقید کی تہہ میں یہ تعمیری جذبہ کارفرما تھا، کہ خیالات و افکار کی نئی بستیاں جب بھی بسائی جائیں، اس تنقید کی روشنی میں بسائی جائیں۔ تاکہ دین و فلسفہ ایک دوسرے کے حریف ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے دوست ثابت ہوں۔ ایک دوسرے کے مؤید بنیں۔ اور ایک دوسرے کے اخذ کردہ نتائج و عقائد کی توثیق کرنے کے علاوہ ان کے لیے مزید روشنی فراہم کریں۔

غزالی کی بے حد سخت اور کراری تنقید سے سارٹن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ایک طرح کی رجعت پسندی اور فلسفہ کے خلاف شدید ترین تخریبی کوشش تھی، جو روا رکھی گئی۔ اور یہ کہ اس سے مسلمانوں میں فکری ارتقا کے داعیے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے لیکن ہمارے نزدیک غزالی کے باب میں یہ سوئے ظن صحیح نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیونکہ تنقید بجائے خود ایک تعمیری اور تقدم پسندانہ فعل ہے، اور غزالی نے مروجہ ارسطا طالیسی فلسفہ پر تنقید کر کے گویا فکر و دانش کے نئے دریچوں پر دستک دی ہے، اسے رد کیا یا ختم نہیں کیا۔

ابن رشد

ابن رشد کا تعلق قرطبہ سے ہے ۵۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دور کے مشہور فلسفی، سائنسدان اور ماہر موسیقی ابن باجہ سے نسبت تلمذ حاصل کی۔ متداول علوم اسلامیہ میں مہارت پیدا کرنے کے علاوہ فلسفہ و طب کے میدان میں بھی تنوع و کمال سے متصف ہوئے، نہایت بلند پایہ اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں فصل المقال۔ الکشف عن مناہج الادلۃ اور تہافۃ التہافۃ زیادہ مشہور ہیں۔ فصل المقال کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہو چکا ہے۔ اس کا موضوع یہ نازک موضوع ہے کہ شریعت و فلسفہ میں رشتہ و تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ الکشف میں عقائد و ایمانیات کی فلسفیانہ توجیہات ہے جو شبہے ابھرے اور جو گمراہیاں پیدا ہوئیں، ان کی توضیح مرقوم ہے اور تہافۃ التہافہ کا تعلق غزالی کی زیر بحث کتاب تہافۃ الفلاسفہ کے ان دلائل و اعتراضات سے ہے، جو فلسفہ کی تردید میں پیش کیے گئے۔

ابن رشد نے طب کے بارے میں متعدد رسائل لکھے جن میں الکلیات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن بحیثیت طبیب معالج کے ان کی شہرت نہیں ہو پائی۔ قدرت نے چونکہ انھیں فلسفہ کے ذوق خاص سے نوازا تھا اس لیے یہی فن ان کی شہرت کا باعث بھی بنا۔

متکلمین

فلسفہ و حکمت صرف ایک علم ہی نہیں بجائے خود تہذیب و ثقافت کا ایک اسلوب بھی ہے اس سے ایک خاص طرح کا ذہنی سانچہ تیار ہوتا ہے۔ خیالات و افکار اور تاویل و تعبیر کے زاویے بدلتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جہاں اونچے ذہنوں میں عمق اور خیالات میں لطافت و گہرائی پیدا ہوتی ہے، وہاں اتھلی طبیعتوں میں اس کا ردعمل شدید مضر اثرات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے لوگ مذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور فرائض میں تساہل برتتے ہیں اور اخلاق و عادات میں ایک طرح کے غرور و پندار کو سمو لینے کی خو پیدا کر لیتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ عقل و دانش کی روشنی سے ایمان کی استواری و محکمی کا اہتمام کریں۔ اور عمل و سیرت میں توازن، اعتدال اور معقولیت اختیار کریں الٹا بے دینی اور الحاد پر اترانا شروع کر دیتے ہیں۔ فلسفہ کے کچھ اسی نوع کے غلط اثرات کو جب حساس دینی طبائع نے اسلامی معاشرہ میں محسوس کیا، تو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ اسی علم کی روشنی میں اپنے عقائد و افکار کا جائزہ لیں اور اس کو ایک منفرد رنگ میں پیش کرنے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوشش کریں۔ اس طرح کی علمی و دینی جد و جہد سے اسلام میں حکما کے مقابلہ میں متکلمین کا گروہ ابھرا۔

ان حضرات نے فلسفہ اور ذہن دونوں کے دائروں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ فلسفہ کے دائرہ میں انھوں نے اس فن کی تحدیات کا جواب دیا۔ اس میں اذعانیت کے عنصر کی نشان دہی کی اور دین و دانش کے مابین مشترکہ نقاط کا تعین کر کے اس بدگمانی کو دور کر دیا کہ ان میں حقیقتاً ان بن یا اختلاف یا تضاد رونما ہو سکتا ہے۔ متکلمانہ کوششوں سے دین کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس کے رخ روشن پر نکھار آیا۔ اہم اور غیر اہم کا فرق واضح ہوا۔ تعبیر و استدلال کے نئے نئے پیمانے فکر و نظر کے سامنے آئے اور سوچ کی اہمیت بڑھی اور خصوصیت سے صفات الٰہی کے معاملہ میں تشریح و بیان نے ایسا معقول اسلوب اختیار کیا، جس سے بڑی حد تک اللہ تعالیٰ کے بارے میں بشریت کے لوازم کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ اعتراض دور ہو جاتا ہے کہ اسلام نے خدا کو بشر اکبر کے رنگ میں پیش کیا ہے۔

اساسیاتِ اسلام

از مولانا محمد حنیف ندوی

اس دورِ تشکیک میں عالم اسلامی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا کی روشنی میں کیونکر از سر نو مربوط اور استوار فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا کی یہ کاوش علمی اسی اہم مسئلہ کے حل و کشود کو بہ احسن درجہ پورا کرتی ہے اس میں اثبات باری، اسلام کے نظام حیات، ایمان بالآخرۃ اور اسلام کے اخلاقی نظام کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی کی گئی ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مفہوم کیا ہے۔ نظام حکومت کے متعلق اسلام کس نظریہ کا حامل ہے، اور یہ کہ دولت کی تقسیم کے بارے میں اسلام کا تصورِ عدل کس اقتصادی ڈھانچے کا متقاضی ہے؟

صفحات ۴۸۰ قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com